Fikr-o-Nasar (Islamabad) 46:1,2 (2008)

فکر و نظر............ اسلام آباد جلد: ۴۶ شمارہ: ۱،۲

کشفی صاحب...... ایک تأثر

پروفیسر محمد اقبال جاوید

میرے نزدیک یہ ایک حسین اتفاق ہے کہ جناب محمد ابوالخیر کشفی اُسی دن (۱۵ مئی ۲۰۰۸ء) اللہ پاک سے جا ملے جس دن انہیں اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق مدینہ منورہ میں ہونا چاہیے تھا۔ فطرت کا لائحہ عمل اپنا ہوتا ہے۔ انسانی ارادے اور ''خاکی خاکے'' ناپائیدار ہیں جبکہ مشیت کے فیصلے اٹل ہیں: ؎

اجل کے ہاتھ کوئی آ رہا ہے پروانہ
نہ جانے آج کی فہرست میں رقم کیا ہے

گو وہ کئی بار دیارِ خدا و رسول ﷺ میں حاضری دے چکے تھے مگر اب کے بلاوے کا انداز مختلف تھا۔ ۱۵ مئی کو دیارِ ناز میں حاضری کی تڑپ بھی اُن کے دل کی لرزتی اور ڈولتی دھڑکنوں میں یقیناً لَو دے رہی ہوگی۔ سچ یہ ہے کہ خوب سیرت لوگوں کو ایسی ہی خوبصورت موت آیا کرتی ہے اور یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔

دے کر غبارِ شہر محبت کی آرزو
کس نے چراغ ہجر کا آنکھوں میں رکھ دیا
کتنا کرم کیا ہے خدائے رحیم نے
اُنؐ کی ثنا کو ڈوبتی سانسوں میں رکھ دیا (ﷺ)

اُردو ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم ہونے کے ناطے میں جناب کشفی کی ادبی، تعلیمی اور تنقیدی صلاحیتوں سے کم و بیش آشنا تھا۔ یہ محض ایک علمی رابطہ تھا جبکہ قلبی اور رُوحانی تعلق ۱۹۹۵ء میں، تب ہوا جب برادرِ عزیز محمد صبیح رحمانی نے ''نعت رنگ'' جاری کیا اور اس میں کشفی صاحب نے نعت اور فنِ نعت نگاری کے مختلف پہلوؤں کا اپنے نقطۂ نظر سے مسلسل جائزہ لینا شروع کیا اور پھر ''السیرۃ عالمی'' کراچی میں انہوں نے نبی کریم ﷺ کے بارے میں پیہم مضامین لکھے۔ میں اُن کے اندازِ تحریر کا ایک نوع سے دل دادہ تھا کہ وہ سوزِ دل کو سازِ رگِ جاں بنانے کا فن جانتے تھے۔ اُن کے جملے شگوفوں کی طرح چٹکتے اور اُن میں مضمر خیالات گلوں کی طرح مہکتے تھے۔ اُن کی نثر میں تغزل لفظ لفظ چھلکتا تھا، یاد رہے کہ تغزل، غزل تک محدود نہیں ہے، بلکہ یہ تأثر آفرین اظہار کا وہ ایمانی انداز ہے

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

جو ذہن کے ساتھ ساتھ دل کو بھی مسخر کرتا چلا جاتا ہے۔ حق یہ ہے کہ ان کے چھوٹے جملوں پر مصرعوں کا گمان گزرتا تھا۔ اور اُن کے بعض نثر پارے آزاد نظموں کا آہنگ لیے ہوتے تھے۔ سوزِ دروں کی یہی وہ آنچ اور حسن بیان کی یہی وہ ادا تھی جس نے مجھ سے ان کے بارے میں کم و بیش ۴۰ صفحات پر مشتمل ایک مبسوط تحریر لکھوائی عنوان تھا: ''نعت اور آداب نعت گوئی-افادات کشفی کی روشنی میں'' میں نے اس کے آغاز میں لکھا تھا:

''جناب سیّد محمد ابوالخیر کشفی سے میں ذاتی طور پر شناسا نہیں ہوں، اُن کی تحریروں سے تعارف ''نعت رنگ کراچی'' کی وساطت سے ہوا۔ جوں جوں انہیں پڑھتا گیا، توں توں رُوحانی طور پر اُن کے قریب ہوتا گیا اور ظاہری شناسائی بےمعنی سی ہو کر رہ گئی کہ

تصور خود بنا لیتا ہے تحریروں سے تصویریں
مری محفل میں نادیدہ بھی نادیدہ نہیں ہوتے''

نعت، توصیفِ رسالت مآب ﷺ ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ تعریف شعر ہی میں ہو، عربوں کے نزدیک تو شعر، نام ہی کلامِ موزوں کا ہے۔ گویا خوبصورت خیال کو، دل آویز لفظوں میں ڈھلا ہوا ہونا چاہیے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ ارفع خیال کو مرصّع پیرایۂ اظہار فطری طور پر مل جاتا ہے۔ یہ بات ہی کا حسن ہے جس کی بناء پر بعض موزوں نثری جملے سن کر، شعر بھی شرما جاتے ہیں۔ بعض نثری تحریریں اس قدر سحر آفریں ہوتی ہیں کہ وہ ذوقِ سلیم کو مدتوں مسحور لذت رکھتی ہیں۔ گویا حضور ﷺ سے متعلق تحریر میں جب ''محبت، خیال اور فن تینوں اجزا مل کر ایک وحدت کی صورت اختیار کر جائیں'' تو اسے ہم نعت ہی کے حسن سے تعبیر کریں گے کہ نعت ایک ایسی دل آویز اور دل نواز صنفِ سخن ہے جو خود خیالی کو رعنائی، لفظ کو زیبائی اور انداز کو توانائی عطا کرتی ہے کیوں کہ اس کی اساس فرضی نہیں بلکہ اس حقیقی محبت پر استوار ہے جس پر ایمان کا ایوان ایستادہ ہے، اور ...... یہی محبت، لفظوں میں ایک کیمیاوی تغیر برپا کرتی ہے کہ محبت اپنی کیمیا آپ ہے...... احسان دانش کہاں یاد آ گئے، کہتے ہیں: ؎

وفا کا سوز تو کندن بنا دیتا ہے انساں کو
محبت جس کو خاکستر کرے گی کیمیا ہو گا

نعت اور فن نعت گوئی کے بارے میں کشفی صاحب کے چند جملے دیکھیے اور غور کیجئے کہ کیسے قلزم، قطرے میں سمٹتا اور جذبے کی وسعت، نوک مژدہ پہ تلتی ہے:

☆ نعت ایک نغمۂ نور ہے۔
☆ یہ رُوحانی تغزل ہے۔

☆ یہ ایک ایسی جنبش لب ہے جس میں روح لفظوں میں ڈھل جاتی ہے۔ اسی نسبت سے لفظ معتبر ہو جاتے ہیں۔
☆ یہ ذکر زبان و اسلوب کے اُن سارے قرینوں اور سلیقوں کا تقاضا کرتے ہیں جو ذہن، فن اور زبان پر انسانی دسترس کی آخری حدوں پر نظر آتے ہیں۔
☆ نعت میں، الفاظ خود بخود خوشبو اور روشنی کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔
☆ نعت، ایک سیارۂ نور اور شرارِ معنوی ہے۔
☆ ضروری ہے غزل کی شوریدہ بیانی، نعت میں آدابِ عبادت کے قالب میں ڈھل جائے۔
☆ نعت ایک تجلی مسلسل ہے۔
☆ لفظ حضورﷺ کی خاکِ پا سے مَس ہو کر آئینہ صفت اور قیمت میں روکش لعل و جواہر ہو جاتے ہیں۔

عرصہ ہوتا ہے جناب کشفی نے مجھے اپنا نعتیہ مجموعہ ''نسبت'' بھیجا۔ تو میں نے اپنے مکتوب میں اُن کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''یقین کیجئے کہ مدت کے بعد ایک ایسی کتاب ملی جسے پڑھ کر درد چھکتا اور روح مہکتی رہی اور میری بے کیفیوں کو ایک طویل عرصے کے بعد کیف ملا۔ پلکوں پر ستارے لرزتے اور موتی ٹوٹتے رہے۔ جب کہ یہ گوہر، آنکھوں میں پتھرا سے گئے تھے۔ میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ کے طفیل وہ آنسو نصیب ہوئے جن سے دل کا غبار دھلتا اور حائل حجاب اٹھتے ہیں''۔

میں سمجھتا ہوں کہ پایانِ عمر میں ''نعت رنگ، السیرۃ عالمی اور تعمیر افکار'' نے اُن کی سوچ کے رُخ اور قلم کے انداز کو سیرتِ رسول پاکﷺ کی سچائیوں اور رعنائیوں کی طرف موڑ دیا تھا اور انہوں نے علم و نظر کی بہترین رسائیوں اور اظہار و بیان کی قابل قدر توانائیوں کے ساتھ نبی کریمﷺ کی مدح و ثنا کا حق ادا کرنے کی امکانی سعی کی اور حق یہ ہے کہ مشیتِ ایزدی نے بھی سعی انسانی کی بھرپور تائید فرمائی۔ نعت اور ''انوارِ نعت، سیرت اور اسرارِ سیرت کے بارے میں اُن کے مضامین جہت نما ہی نہیں، منزل نشاں بھی ہیں۔ تحریر میں تاثیر اور بیان میں حسن نہیں آ سکتا جب تک محبوبِ نظر، دل کی دھڑکنوں میں نہ بستا ہو۔ جب تک محبوب کی رضا اور عطا، محبّ کے شریک حال نہ ہو۔ بیان حسن کو حسن بیان کی ثروت ملا ہی نہیں کرتی۔ ؎

نگاہِ ناز جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

اللہ تعالیٰ نے جناب کشفی کو دل کی بیداری اور ذہن کی تابندگی سے نواز رکھا تھا۔ ذہن و دل کی اس پاکیزہ ہم آہنگی کا فیض تھا کہ وہ جب بھی نعت اور سیرت کے موضوع پر قلم اٹھاتے تھے تو ان کی منزہ فکری اور مطہر قلبی کے باعث قاری کو بھی بقدر ظرف گداز و تپش اور نیاز و ناز کی دولت ملتی تھی اور اس کا تصور اس ستھرے اور نکھرے ماحول میں پہنچ جاتا تھا جس کے حسن و تاثر کو الفاظ کا کوئی سا پیرایہ، اظہار کا کوئی سا سلیقہ اور شاعری کا کوئی سا قرینہ بھی بیان نہیں کر سکتا۔ ؎

اسم محمدؐ سے اندھیروں میں جلائی قندیل
برقِ تابندہ ہے کشفی کی زباں تو دیکھو

دنیا و آخرت کی ہر توقیر، اسم محمد ﷺ کو لبوں پر سجانے اور حُبِّ محمد ﷺ کو دلوں میں بسانے سے عبارت ہے، تعلق کی اس استواری سے محبت کو تازگی اور بالیدگی ملتی ہے اور وہ غنچہ سے گُل اور گُل سے گلزار بنتی ہے۔ جگر، کس قدر برمحل بات کہہ گئے ہیں: ؎

جب عشق اپنے مرکز اصلی پر آ گیا
خود بن گیا حسین، زمانے پہ چھا گیا

زندگی کے آخری سالوں میں جناب کشفی کا قلم زیادہ تر حمد و نعت ہی کے لیے وقف رہا اور ادبی اور تنقیدی موضوعات پس پردہ چلے گئے کہ......

ع وادیٔ گُل چھوڑ کے کون بیاباں میں رہے

جس خوش نصیب نے اس ذاتِ اقدس ﷺ کی ایک جھلک دیکھ لی ہو جو کائنات حسن بھی ہے اور حسن کائنات بھی ہے۔ اس کے نزدیک مجاز کا ہر رنگ، بے رنگ ہو کر رہ جایا کرتا ہے اور پھر اس کی نگاہوں میں نہ کوئی در جچتا ہے نہ دیار، جناب کشفی کا یہ شعر میرے اس خیال کا مؤید ہے۔ ؎

کشفی کی نگاہوں میں اب نقش نہیں کوئی
محرابِ تہجد میں سراپا ﷺ نظر آئے

اُن کے والدِ ماجد جناب ثاقب کانپوریؒ کی شاعرانہ تاب و تب، حضرت سیّد زوّار حسین شاہؒ کا التفاتِ فراواں اور حضرت سیّد ابوالحسن علی ندویؒ کی توجہاتِ عالیہ، ہی کا حاصل تھا کہ وہ سیرتِ رسول پاک ﷺ کی طرف آئے تو ایسے آئے کہ علمی اور ادبی نقد و نظر کی طرف پلٹ کر دیکھا بھی نہیں،

آخر میں انہیں دکھ رہا وقت کے بعض عظیم شاعروں سے کہ قادرالکلامی کی جملہ صلاحیتوں کے باوصف، اُن کے قلم کو حمد و نعت کی توفیق نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کے خاندان کے دینی رجحان، شعری اور ادبی ذوق اور وقت کے صاحب دل احباب کی صحبت نے ابوالخیر کے انجام کے بخیر ہونے میں اعانت کی ہے۔ ؎

کیسے کوئی عزیز روایات چھوڑ دے
کچھ کھیل ہے کہ کہنہ حکایات چھوڑ دے
گھٹی میں تھے جو حل وہ خیالات چھوڑ دے
ماں کا مزاج، باپ کے عادات چھوڑ دے

ورنہ کتنے ہی عظیم سخنور ہیں کہ اُن کی تمام عمر مجاز کی بے نام وادیوں میں بہکتے اور بھٹکتے گزر جاتی ہے۔

جناب کشفی کے آخری تیرہ سالوں میں لکھی گئی تحریروں کی اکثریت، حُبِّ رسولﷺ سے مستنیر رہی۔ وہ تحریریں اسی جذبے سے تقدس سمیٹتی اور وقت کے اندھیروں میں اُجالے بکھیرتی رہیں۔ ورنہ اپنے عہد کے ادب اور ادیبوں کا جائزہ لینے والا قلم، قدیم و جدید شعر و ادب کی کون سی گتھیاں ہیں جو نہیں سلجھا سکتا تھا۔ ''حیاتِ محمدﷺ-قرآن پاک کے آئینے میں'' ان کی سوچ کی سچائی، ''نسبت'' (اُن کا نعتیہ کلام) اُن کے تعلق کی رعنائی اور ''وطن سے وطن تک'' (اُن کا سفر نامہ حجاز) اُن کی چاہت کی زیبائی کا ایک ایسا قلمی اظہار ہے جس کا رنگ و آہنگ، سنگینی گردش ایام پر خندہ زن ہے۔ دل کہتا ہے کہ یہ سچائی، یہ رعنائی اور یہ زیبائی، اُن کی آخری آرام گاہ کو جنت کی مشکبو ہواؤں سے شاداب رکھے گی۔ ؎

گزرے جو اس طرف سے وہ گرویدہ ہو تیرا
یوں عنبریں ہو میری لحد، سیّدالوراءؐ

جناب سیّد محمد ابوالخیر کشفی، ایک شخص نہیں، ایک شخصیت تھے، ایک فرد نہیں، ایک انجمن تھے۔ ان کی ذات میں ایک معلم کی شفقت، اُن کے قلم میں ایک ادیب کی عظمت، اُن کی نگاہ میں حیا کی معصومیت، اُن کے دل میں ایمان کی حلاوت اور اُن کی روح میں خشیت الٰہی کی جھلک تھی۔ اُن کی تحریروں میں، تاریخ کی واقعیت، ادا کا حسن اور جذبے کی حدت، منتہائے کمال پر پہنچ کر ہم آہنگ ہو گئی تھی۔ وہ فی الواقع ایک عہد آفریں اور ہمہ جہت وجود تھے۔ اُن کے ساتھ خبر و نظر اور جذب و

جنوں کا ایک کیف افزا امتزاج قبر کی گہرائیوں میں اُتر گیا ہے۔ ؎

کس کو خبر اس ایک جنازے کے ساتھ ساتھ
قبروں تک اپنی کتنے جنازے گئے ہیں آج

انہیں جو کچھ ورثے میں ملا اور انہوں نے جو کچھ سعی بلیغ سے حاصل کیا اور جس خوبصورت انداز سے انہوں نے ان توارثی اور اکتسابی نعمتوں کو بانٹا، اس انداز میں وقعت بھی ہے اور وقار بھی۔ لطف بھی ہے اور لطافت بھی۔ شگفتگی بھی ہے اور شائستگی بھی اور دورِ حاضر کی بے ذوق فضا کو اس ادبی اور روحانی فیضان کی اشد ضرورت تھی کہ نسل نو اسلاف کے نقوشِ پا کی تابانیوں سے محروم اور بیگانہ ہوتی چلی جا رہی ہے اور آج اُن کے بچھڑ جانے سے، ہم پسماندگان کے لیے لازم ہو گیا ہے کہ ہم ''ان کے قلم سے بکھرنے والی مہک سے مشام جاں کو معطر رکھیں کہ یہ واحد طریقہ ہے، خود کو اُن کے لیے صدقہ جاریہ بنانے کا۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں:......

''ہر آدمی کی وفات پر خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا، مسلمان کی زبان پر بے ارادہ دعائے مغفرت آتی ہے۔ دعائے مغفرت مانگ کر مرحوم کو جوارِ رحمت میں دے دینا ٹھیک ہے لیکن مغفور کو محبت و احترام سے اپنے شعر و ادب میں، آنے والی نسل کی محبت و احترام کے لیے محفوظ کر دینا اور اس کی امانت میں دے دینا، دعا سے آگے کی چیز ہے''......

☆☆☆☆☆